پھر فرض کیجیے

فرض کیجیے کہ آج رات آپ کو اپنی بیگم کے ساتھ کسی شادی میں جانا ہے۔ آپ دونوں بینک جاتے ہیں اور بیگم کے پہننے کے لیے ساری جیولری نکلوا کر گھر لے آتے ہیں۔ راستے بھر میں آپ کسی چور راہزن سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یہی حال شادی میں جاتے اور آتے وقت رہتا ہے مگر کچھ نہیں ہوتا۔ آپ دونوں اطمینان اور بے فکری سے سو جاتے ہیں۔ صبح اٹھنے پر پتہ چلتا ہے کہ چور رات میں اور خاموشی سے آپ کے گھر سے سارا زیور چرا کر لے گئے ہیں۔ آپ تھانے کے چکر لگاتے ہیں۔ پولیس کی منت کرتے ہیں کہ آپ کا کل سرمایہ لٹ چکا ہے، مگر بے سود۔

فرض کیجیے آپ ایک نوجوان بچے کے باپ ہیں جس سے آپ کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ روز کالج جاتا ہے۔ محنت سے پڑھتا ہے۔ آپ خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ ایک روز آپ کو پتہ چلتا ہے کہ کالج سے واپسی پر اسے ایک بس نے ٹکر ماردی۔ آپ کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ آپ دیوانہ وار دفتر سے ہسپتال بھاگتے ہیں۔ پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہیں جو آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی بلک بلک کر رو رہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر آپ کو آکر بتاتا ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں۔ آپ ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتے ہیں کہ میرے بچے کو بچا لیجیے۔

فرض کیجیے کہ چند دن سے آپ کی طبعیت کچھ خراب ہے۔ مگر ایسی نہیں کہ چھٹی لے کر گھر بیٹھ جائیں۔ مگر آپ مکمل نارمل بھی نہیں۔ آپ اپنے مسائل لے کر فیملی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ وہ کچھ دوائیں دیتا ہے۔ کچھ ٹیسٹ لکھتا ہے۔ آپ دوا کھاتے ہیں۔ فائدہ ہو جاتا ہے۔ مگر احتیاطاً آپ ٹیسٹ بھی کرا لیتے ہیں۔ ٹیسٹ کی رپورٹ آنے پر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہے۔ آپ کے گھر میں کہرام مچ جاتا ہے۔ پھر علاج شروع ہوتا ہے۔ لاکھوں روپے برباد کر کے اور بے پناہ تکلیف اٹھا کر بھی آپ ہسپتال کے بستر پر پڑے موت کی آہٹ سننے پر مجبور ہیں۔ آپ کے بچے تڑپ رہے ہیں۔ بیوی کے چہرے پر تاریکی

چھائی ہوئی ہے۔آپ کی دنیا بھی اندھیر ہو چکی ہے۔

اطمینان رکھیے۔ ہم صرف فرض کر رہے ہیں۔ ابھی تک ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔آپ نے جیولری با حفاظت بینک لاکز میں رکھوادی۔آپ کا بچہ روز پڑھنے جاتا ہے اور خیر سے آجاتا ہے۔ آپ کی طبیعت گرچہ ناساز ہوئی مگر معمولی سا مسئلہ تھا جو دوا سے حل ہو گیا۔اس دنیا میں اس جیسی ہزار چیزیں فرض کی جاسکتی ہے۔مگر ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔آپ کو کسی کی منت نہیں کرنی پڑتی۔کسی کے آگے گڑگڑانا نہیں پڑتا۔آپ کی بیوی بلک بلک کر نہیں روتی۔آپ کے بچے تڑپتے نہیں۔آپ کا مال محفوظ ہے۔عزت کو بٹہ نہیں لگا۔جان عافیت میں ہے۔

چلیے دو لمحے کے لیے ایک دفعہ پھر فرض کر لیجیے کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔آپ کا مال لٹ گیا ہے۔آپ کی جوان بیٹی کی آبرو پر حرف آگیا ہے۔آپ کا بچہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔آپ خود ہسپتال میں پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کر رہے ہیں۔کرب کے ان لمحوں کا تصور کیجیے۔سوچیے کہ آپ کو کہاں کہاں بھاگنا اور کن کن لوگوں کے آگے گڑگڑانا پڑ رہا ہے۔اور پھر اس ہستی کا تصور کیجیے جو عافیت کا قلعہ بن کر آپ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

وہ آپ سے کچھ نہیں مانگ رہا۔مگر آپ اس کے قدموں پر احسان مندی کے جذبے سے گر جائیے کہ اس نے آپ کے مال کو بچالیا۔وہ اپنے احسانوں پر اپنی تعریف نہیں سننا چاہتا۔مگر آپ بہتے ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوتے ہونٹوں سے اس کی تعریف کیجیے کہ آپ کی اولاد محفوظ ہے۔وہ آپ کے ہر گناہ کو دیکھ کر بھی انجان بن رہا ہے اور عافیت، نعمت اور زندگی نہیں چھین رہا۔ آپ بھی عزم کر لیں کہ اب کبھی اس کو ناراض نہیں کریں گے۔

ابھی وقت ہے۔جس نے دوسرے کے سامنے جھکنے نہیں دیا۔ اس کے سامنے جھک جائیں۔جس نے دوسروں کے سامنے تڑپنے سے بچالیا اس کے سامنے رولیں۔جس نے دوسرے کا احسان اٹھانے سے بچالیا اس کی بندگی اختیار کر لیں۔

تین نسلوں میں

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز ادا کی اور ارشاد فرمایا کہ آج روئے زمین پر جتنے انسان زندہ ہیں سو سال بعد ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، (بخاری، رقم 601)۔ اس بات سے سامعین میں سے بعض کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ حضور قیامت کے آنے کا ذکر کر رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ زندگی کا عارضی پن واضح کرنے ایک کا بڑا موثر طریقہ تھا۔

انسانوں کی اوسط عمر عام طور پر ساٹھ ستر برس ہوتی ہے۔ جبکہ انفرادی طور پر سو برس سے زیادہ بالعموم کوئی شخص نہیں جی پاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سن 1914 میں جو لوگ پیدا ہوئے وہ آج 2014 میں موجود نہیں اور جو آج ہیں ان میں سے کوئی 2114 میں نہیں ہوں گے۔ زندگی کی ناپائیداری کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ سو برس میں انسان ہی نہیں مرتا تیسری نسل میں اس کا نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے۔

ایک شخص جب اوسط عمر میں مرتا ہے تو وہ اپنی اولاد کو اپنے سامنے پروان چڑھتا دیکھتا ہے۔ اس کی اولاد کی اس سے بڑی گہری وابستگی ہوتی ہے۔ اس کے مرنے پر اولاد کو بہت دکھ اور غم ہوتا ہے۔ لیکن چند برسوں میں یہ اولاد اس کا بنایا ہوا گھر چھوڑ چکی ہوتی ہے۔ اس کی یادیں مدھم ہو جاتی ہیں۔ اس کی برسی فراموش کر دی جاتی ہے۔

جب پوتے اور نواسے بڑے ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں بزرگوں کے بس دھندلے سے نقوش ہوتے ہیں۔ یہ نقوش بس اسی وقت تازہ ہوتے ہوتے ہیں جب کسی کو دفنانے قبرستان جانا ہوتا ہے اور باپ بیٹے کو بتاتا ہے کہ یہ اس کے دادا کی قبر ہے۔ مگر پوتے کی اولاد تک قبر کا نشان بھی مٹ جاتا ہے اور یوں تیسری نسل میں انسان کا نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے۔

کتنا نادان ہے وہ انسان جو اِس دنیا کے لیے جیتا ہے جہاں سو سال میں وہ خود اور تین نسلوں میں اس کا نام ونشان بھی مٹ جائے گا۔

داستانِ غم

آج کے دور میں جس سے ملیے وہ اپنے دکھوں اور مسائل کی داستان سناتا ہوا ملے گا۔ جو مسائل کا ذکر نہیں کرتا وہ نہ ملی ہوئی چیزوں اور محرومیوں پر سراپا حسرت و یاس بنا ہوا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے پاس موضوعِ گفتگو اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ ان کے پاس کیا نہیں ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ گفتگو وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دور میں انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک عام آدمی کو بھی وہ کچھ میسر ہے جو ماضی میں بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں تھا۔

اس بات کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آج کے لوگوں کو رفع حاجت کے لیے کمرے سے باہر بھی نہیں جانا پڑتا اور اسی اٹیچ باتھ روم میں وہ سخت سردی میں گرم پانی سے نہاتے ہیں۔ جبکہ سخت گرمی میں ٹھنڈے اے سی اور مسلسل ہوا والے پنکھے کی سہولت کبھی کسی فاتح عالم کو بھی نہیں نصیب نہ ہوسکی۔ ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹے میں طے کر کے مکہ پہنچنے کی سعادت کبھی کسی پیغمبر کے حصے میں بھی نہیں آئی۔ مگر آج کے ہر انسان کے لیے یہ معمول کی بات ہے۔

ان جیسی نجانے کتنی مثالیں ہر سو بکھری ہوئی ہیں۔ مگر کوئی شخص ان کو دریافت کر کے اپنے مالک کے حضور سجدے میں نہیں گرتا۔ کوئی نہیں جو روتا اور گڑگڑاتا ہوا یہ کہے کہ پروردگار تو نے مجھے وہ دیا جو بادشاہوں کو دیا نہ نبیوں کو ملا۔ ہاں غربت کے شکوے بہت ملیں گے۔ محرومی کی شکایت بہت بیان ہوگی۔ مایوسی کے قصے بہت سنائے جائیں گے۔

مگر کاش کوئی ان دکھی لوگوں کو یہ بتائے کہ یہ ہزار پاکر ایک کے کھونے کا شکوہ کر رہے ہیں۔ اہم ترین پاکر بہت کم کی محرومی سے رنجیدہ ہیں۔ کاش یہ لوگ اس حقیقت کو جان لیں تو ان کے دکھ کے آنسو شکر گزاری کے موتیوں میں بدل جائیں گے۔ ان کی محرومیاں احسان مندی کے لہجے میں ڈھل جائیں گی۔ پھر ایک روز خدا انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی ختم نہ ہونے والی نعمتوں میں بسا دے گا۔ جہاں کوئی دکھ ہوگا نہ کوئی محرومی۔

اسلامی روحانیت

اسلام ایک ایسے دور میں آیا جب دنیا میں روحانیت کا مطلب ترک دنیا، عبادت کے نام پر مشقت اٹھانے اور رشتے ناطوں سے قطع تعلق کا نام تھا۔ مگر ایسے میں اسلام نے روحانیت کا ایک بالکل جدا اور منفرد تصور دیا جو کسی کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا۔

اس روحانیت کی پہلی اساس ایک اللہ سے سچی محبت تھی۔ مگر اس محبت کا مطلب دنیا چھوڑنا نہیں بلکہ اس کی یاد میں رہ کر دنیا میں جینا تھا۔ اس روحانیت میں تہجد پڑھنے سے زیادہ اہمیت مسجد میں نماز پڑھنے پر تھی تاکہ دوسروں کے حال احوال سے باخبر رہا جاسکے۔ اس روحانیت میں انسان کا مال کمانا عبادت اور اسے بندوں پر خرچ کرنا عبادت کی معراج تھی۔ اس روحانیت میں روزہ رب کے لیے رکھا جاتا تھا، مگر احساس دوسروں کی بھوک کا پیدا کیا جاتا تھا۔

یہ روحانیت عدل کرنے کا نام تھی۔ چاہے دشمن کا معاملہ ہو یا اپنے ماں، باپ اور بھائی، بہن جیسے قریبی رشتوں کا۔ اس روحانیت کا اصول تھا کہ نبی کی بیٹی بھی اگر کسی جرم میں گرفتار ہوئی تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

یہ روحانیت احسان کا نام تھی؛ کمزوروں کے ساتھ، ضعیفوں کے ساتھ، معذوروں کے ساتھ۔ یہ روحانیت ایثار سے عبارت تھی؛ اپنا مال دوسروں پر خرچ کرکے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلا کر، اپنا حصہ بھی دوسروں کی جھولی میں ڈال کر۔ یہ روحانیت انفاق کا مطالبہ کرتی تھی؛ رشتہ داروں پر، غریبوں پر، مسکینوں پر اور سفید پوشوں پر۔

یہ روحانیت لوگوں سے مسکرا کر ملنے، انھیں معاف کرنے، دوسروں کی ایذا پر صبر کرنے کا نام تھی۔ یہی وہ روحانیت تھی جس نے ایک دنیا کو فتح کرلیا تھا۔ آہ مگر آج اسلام کے نام پر سارے تماشے ہو رہے ہیں۔ یہ ایمان، احسان اور عدل والی روحانیت کہیں نہیں۔

Intelligent Design

جدید علم الکلام میں خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل انٹیلی جنٹ ڈیزائن کی ہے۔ انٹیلی جنٹ ڈیزائن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایک زندہ، باشعور اور ذہین خالق کی تخلیق ہے جس نے اس دھرتی پر کائناتی قوتوں کو اس طرح منظّم کیا ہے کہ یہ زندگی کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ اس حوالے سے ایک صاحب کے کچھ اعتراضات ایک دوست نے مجھے بھیجے۔ معترض کے بقول انسانی جسم میں جو بعض حیاتیاتی نقائص پائے جاتے ہیں، ان کی بنا پر انٹیلی جنٹ ڈیزائن کا تصور غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ انھوں نے قرآن کی آیت ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے'' کو لیا اور ان نقائص کی روشنی میں ثابت کیا کہ یہ آیت اور انٹیلی جنٹ ڈیزائن کا تصور دونوں ہی غلط ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں سطحی اندازِ فکر کا نمونہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اسی انٹیلی جنٹ ڈیزائن یا ''بہترین ساخت'' کو لے لیجیے۔ انھوں نے بہت سطحی انداز سے اس کا مطلب پرفیکٹ یا ''کامل'' نکالا اور اپنی طرف سے کچھ نقائص بیان کر کے یہ سمجھ لیا کہ قرآن کی تردید ہوگئی۔ حالانکہ کسی چیز کا کامل ہونا بالکل الگ اور بہترین ہونا الگ ہوتا ہے۔ کامل کا مطلب بے عیب ہوتا ہے اور بہترین کا مطلب بے عیب نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے مقابلے میں بہتر ہونا ہوتا ہے۔

انسانی جسم ہو یا اس کائنات میں کارفرما ڈیزائن، کوئی یہ نہیں کہتا کہ وہ پرفیکٹ ہے۔ بلاشبہ یہ کائنات، انسانی جسم اور دیگر مخلوقات کئی پہلوؤں سے ناقص ہیں۔ بلکہ ہمارا تو کہنا ہی یہی ہے کہ وہ آخرت کی دنیا ہوگی جو کامل ہوگی۔ لیکن کیا کوئی اس حقیقت کا انکار کرسکتا ہے کہ اس دھرتی پر وہ سارے انتظامات کیے گئے ہیں جو اسے زندگی کا گہوارہ بنا دیتے ہیں۔ یہ انتظامات ایسی متنوع اور متضاد طاقتوں کو ایک نظم میں لا کر کیے گئے ہیں جو عام حالات میں زندگی کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس حقیقت کا انکار کرنا سورج کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

یہ کائنات، کرہ ارض، وجود انسانی ہر پہلو سے اس طرح بنایا گیا ہے کہ انسان زندہ رہتے ہیں اور کائنات کی ہر چیز ان کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ کائنات ایک قاتل کائنات ہے جو اپنی اصل میں زندگی کی ہر شکل کے لیے موت کا پیغام ہے۔ مثلاً اس کرہ ارض کے علاوہ کائنات میں ہر جگہ درجہ حرارت اتنا زیادہ یا اتنا کم ہے کہ زندگی ایک لمحہ میں ختم ہو جائے گی۔ مگر ایک خالق نے اس دھرتی پر کائناتی قوتوں کو اس طرح منظّم کیا ہے کہ ہر چیز حیات بخش ہو چکی ہے۔ اسی کو انٹیلی جنٹ ڈیزائن کہا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں بلاشبہ یہ بہترین انتظام ہے، گرچہ یہ بعض پہلوؤں سے کامل نہیں۔ تاہم اس غیر کاملیت کی بھی اپنی حکمت ہے، لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اپنی ذات میں اپنے خالق کا تعارف ہے جو کتاب ہستی کے ہر ورق پر لکھا ہے۔ لیکن یہ ورق غور و فکر کرنے والے ہی پڑھ سکتے ہیں۔ سرسری انداز سے دیکھنے والے نہیں۔

بے وقوف آدمی کا اصل المیہ یہ ہے کہ
اس کی کوئی حماقت آخری نہیں ہوتی (ابو یحییٰ)

خوش ہونا ہے تو تعریف سنیے
اور بہتر ہونا ہے تو تنقید سنیے (ابو یحییٰ)

مثال قطرہ شبنم رہے رہے نہ رہے

انسانی زندگی کی بے ثباتی اس عالم فانی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔اس برہنہ حقیقت کو صاحبان کلام جب شعروادب کے پیراہن سے آراستہ کرکے بیان کرتے ہیں تو بلبلے اور حباب کی تشبیہ سے زیادہ موثر کوئی اور چیز محسوس نہیں ہوتی۔علم وادب کی دنیا کا وہ کون سا باسی ہے جو شاعر مشرق کے اس شعر سے واقف نہ ہوگا۔

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

مگر پچھلے برس بے ثباتی حیات کے لیے ایک نئی تمثیل سنی۔ یہ تمثیل اس قطرہ شبنم کی زندگی سے مستعار لی گئی تھی جو گھاس (گیاہ) کی نوک پر گرتا اور لمحہ بھر سے بھی کم میں اپنا وجود کھودیتا ہے۔

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بنوک گیاہ
مثال قطرہ شبنم رہے رہے نہ رہے

اس عاجز نے یہ شعر پچھلے برس اسی اپریل کے مہینے میں محترم بزرگ عبدالستار غوری کی زبانی سنا تھا جنھیں اس برس کا اپریل زیاں خانہ حیات سے نکال کر اس عالم ابدی میں لے گیا جو ہر نقص وزیاں کے شائبے سے پاک ہے۔

آج اگر مسلمانوں میں دعوتی مزاج زندہ ہوتا تو ان کی وفات پر کہرام مچ جاتا۔ کیونکہ جس شعبے میں انھوں نے تحقیقی کام کیا تھا وہ یہود ونصاریٰ پر قدیم صحف سماوی کی روشنی میں یہ ثابت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیاں آج بھی واضح طور پر ان کتابوں میں موجود ہیں۔ نیز یہ کہ حضرت ابراہیم اور ان کی ذریت کا رشتہ ان صحف سماویہ کی روشنی میں کس طرح حرم پاک سے پوری طرح ثابت ہے۔تاہم بدقسمتی سے مسلمانوں کو نہ دعوت سے بہت زیادہ دلچسپی ہے نہ کسی ایسے کام سے جو دور جدید کے مسلمہ تحقیقی معیارات کے مطابق اسلام کی حقانیت غیر

مسلموں پر ثابت کرسکے۔ چنانچہ غوری صاحب کا کام وہ توجہ حاصل نہیں کرسکا جس کا وہ درحقیقت مستحق تھا۔

غوری صاحب کا کام امام فراہی کے اس کام ہی کا تسلسل تھا جو انھوں نے اپنی کتاب ''الرای الصحیح فی من ھو الذبیح ''اور بعض دیگر تصنیفات میں شروع کیا تھا۔ دیگر کئی اہم کاموں کے علاوہ غوری صاحب کا ایک اہم اور نمایاں کام امام فراہی کی اسی کتاب کو دور جدید کے مسلمہ تحقیقی معیارات کے مطابق ڈھال کر پیش کرنا تھا جو ان کی کتاب The Only Son offered for Sacrifice: Isaac or Ishmael? کی شکل میں سامنے آئی جس کا ترجمہ ''اکلوتا فرزند ذبیح اسحاق یا اسماعیل'' کے نام سے ہوا۔ اس کتاب میں انھوں نے اصل معاملے کو زیر بحث لاتے ہوئے بہت سے گراں قدر تحقیقی اضافے بھی کیے۔

غوری صاحب سے میرا ذاتی تعلق ان کے ایک ایسے ہی تحقیقی کام کی بنا پر ہوا۔ اسی کتاب میں ایک ضمنی بحث میں انھوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ زبور کے ایک مزمور میں حضرت داؤد علیہ السلام اپنی ان یادوں کو تازہ کرتے ہیں جن کا تعلق ان کے سفر حج سے تھا۔ وہ اس مزمور کی روشنی میں یہ بتاتے ہیں کہ حضرت داؤد بادشاہ بننے کے بعد بھی جس ''بکہ'' کو یاد کر رہے اور ایک بادشاہ کے بجائے اس گھر کا دربان بننے کی خواہش رکھتے تھے وہ مکہ مکرمہ ہی تھا۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق و رہنمائی سے پچھلے دنوں میں نے زبور کے ایک اور مزمور کے بارے میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے یہ مزمور اسی سفر حج میں عین خانہ کعبہ کے سامنے پڑھا گیا ہے جس وقت سیدنا داؤد حج کرنے مکہ آئے تھے۔ عین اسی وقت آپ نے ''کونے کے پتھر'' والی اپنی مشہور پیش گوئی کی جس میں آپ نے عین حرم پاک کے سامنے کھڑے ہو کر نہ صرف نبی آخر الزماں علیہ السلام کے آنے کی پیش گوئی کی تھی بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس وقت آپ کی قوم بنی اسماعیل کو بھی امامت عالم کے منصب پر فائز کر دیا جائے گا۔ اس پیش گوئی کی اہمیت اتنی زیادہ تھی

کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے بعد میں اسے انجیل میں دہرا کر یہود پر یہ واضح کر دیا کہ ان کے جرائم کی بنا پر انھیں منصب امامت سے فارغ کیا جا رہا ہے اور ایک دوسری قوم کو اس منصب پر فائز کیا جائے گا۔

میں نے اپنے اس نقطہ نظر کو تحریر کرنے کے بعد ان کی وفات سے کچھ ہی دن قبل ان سے فون پر رابطہ کیا اور پھر ای میل پر انھیں یہ تحریر بھیجی۔ تحریر طویل تھی اس لیے کچھ ابتدائی تبصروں کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اس قابل نہیں کہ پوری تحریر پڑھ سکیں اس لیے میں خاص اسی حصے کی نشاندہی کروں جس پر میں ان کا تبصرہ چاہتا ہوں۔ بدقسمتی سے وقت نے اس کا موقع نہیں دیا اور وہ داعی اجل کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میرے لیے پھر بھی یہ احساس بہت غنیمت ہے کہ میں آخری وقت میں کسی نہ کسی درجے میں ذاتی طور پر ان سے استفادہ کرتا رہا۔ پچھلے برس جب برادر عزیز ندیم اعظم اور عزیزم حسن کے ساتھ لاہور گیا تو اتفاقی طور پر ان سے ملاقات ہوگئی۔ انھیں اپنے گھر جانا تھا اور اسی لیے وہ ہماری گاڑی میں بیٹھے تھے مگر ہم زبردستی انھیں اپنے ساتھ کھانے پر لے گئے اور پھر سہ پہر تک ہم ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ندیم اعظم صاحب نے ان کی گفتگو کا ایک حصہ ریکارڈ کر لیا تھا۔ اسی میں خاص طور پر وہ شعر بھی تھا جس کا تذکرہ شروع میں ہوا۔

وہ شعر کی زبان میں اپنے بارے میں ہمیں متنبہ کر رہے تھے کہ اس قطرہ شبنم سے استفادہ کر لو۔ ہمیں بھی خبر نہ تھی کہ اگلی دفعہ ملنے کی نوبت نہ آئے گی۔ اب تو بس ان کا وہی علم بچا ہے جس کی روایت کو آگے بڑھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ یا پھر کچھ یادیں جو ہمیں تلقین کر رہی ہیں کہ ابھی کچھ اور لوگ باقی ہیں جو مانند قطرہ شبنم روشن ہیں اور ان سے استفادہ ابھی ممکن ہے۔

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بنوک گیاہ
مثال قطرہ شبنم رہے رہے نہ رہے

حساب کے پرچے میں شاعری

امتحان لینا اور دینا تعلیمی عمل کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔طلبا سال بھر پڑھتے ہیں، مختلف علوم کی سمجھ پیدا کرتے ہیں اوران جوابات کی تیاری کرتے ہیں جن کے بارے میں امتحان میں سوال پوچھے جائیں گے۔ امتحان میں کسی طالب علم کی کامیابی کا تمام تر انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نے سوال کا درست جواب دیا یا نہیں۔حساب کے پرچے میں اگر شاعری، گرامر اور سائنس کے پرچے میں مذہب اوراخلاقیات کے بھاشن لکھ دیے جائیں تو ممتحن بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فیل کردیتے ہیں۔یہی نہیں حساب کے پرچے میں جمع کے سوال میں تفریق اورضرب کے سوال میں تقسیم کی کہانی لکھنے کا انجام بھی کچھ مختلف نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی کامیابی اور جہنم سے نجات کسی شخص کے لیے ممکن نہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے پرچہ امتحان سے سرخرو نہیں ہوجاتا۔اس امتحان میں اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا کرم کیا ہے کہ سوال بھی بتادیے ہیں اوران کے جواب بھی بیان کردیے ہیں۔مگر یہ عجیب سانحہ ہے کہ ہم مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمیں بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں بھیج دیا جائے گا اور جتنے کچھ سوالات ہوں گے وہ غیر مسلموں سے ہوں گے۔جو لوگ خود کو کسی امتحان میں کھڑا دیکھتے ہیں وہ بھی اپنے پرچہ امتحان میں ہر سوال کا غلط جواب لکھ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بتاچکے ہیں کہ قیامت کے دن بنیادی سوال اللہ تعالیٰ کی ہستی کو اپنے ایمان اور عمل کا مرکزی خیال بنانے کے حوالے سے ہوگا، مگرلوگ غیر اللہ کو زندگی کا مرکزی خیال بنا کر جیتے ہیں۔سوال عبادات کے بارے میں ہوگا، لوگ خرافات اور بدعات کو دین بنا کر جیتے ہیں۔سوال مخلوق کی خیر خواہی، دعوت اور محبت پر ہوگا، مگر ہم نفرت اور دہشت کو اسلام قرار دیتے ہیں۔

لوگوں کا جو دل چاہے وہ لکھتے رہیں مگر اس دینداری کا وہی انجام ہونا ہے جو حساب کے پرچے میں شاعری لکھنے والوں کا ہوتا ہے۔

مکاتیب

ابویحییٰ

[مئی کے مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول کے حوالے سے زبور اور انجیل کی ایک پیش گوئی پر ایک مضمون شائع ہوا تھا۔اس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آنے والے نبی اور ان کے اصحاب کی امامت کی پیش گوئی کردی تھی۔ یہ خط اسی حوالے سے اٹھائے گئے ایک اشکال کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ادارہ]

برادر محترم کاشان اقبال صاحب 22 اپریل، 2014

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

آپ کا ای میل اور تبصرہ موصول ہوا جس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔

جس امکان کا آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ سیدنا مسیح کا اشارہ اپنی امت کی طرف تھا کہ یہود کے عزل کے بعد وہ منصب امامت پر فائز کیے جارہے ہیں یقیناً وزنی ہے۔تاہم اپنی تحقیق کے دوران ہی دو وجوہات کی بنا پر مجھے اس امکان کو رد کرنا پڑا۔پہلی یہ کہ پیش گوئی اصلاً سیدنا داود نے دوران حج کی تھی۔ وہاں نہ صرف اس کونے کے پتھر والی پیش گوئی کی گئی تھی بلکہ ساتھ ہی ایک آنے والے کی کی خوش خبری یہ کہہ کردی گئی تھی:

مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے

یہی نہیں بلکہ اگلے جملے میں وہ اس موقع پر بنی اسماعیل کو یہ کہہ کر دعا دیتے ہیں

ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے

چنانچہ حج کا موقع اور بنی اسماعیل کو دی جانے والی دعا اس بات کی گنجائش کم ہی چھوڑتے

ہیں کہ کونے کے اس پتھر سے مراد جسے معماروں نے رد کر دیا تھا بنی اسماعیل کے سوا کوئی اور لیے جائیں۔

مزید یہ کہ اگر مراد امت مسیح ہوتے تو اس پیش گوئی کو بیان کرتے وقت سیدنا مسیح، مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے کہ الفاظ دہرا کر یہ بھی واضح کر دیتے کہ یہ پیش گوئی ان کے بارے میں کی گئی ہے۔مگر وہ اس کا ذکر نہیں کرتے۔اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ اس کا مصداق خود کو نہیں بلکہ نبی عربی کو سمجھتے تھے اور آگے بھی ان ہی کی قوم یعنی بنی اسماعیل کا تذکرہ ہے۔

دوسری وجہ تاریخی ہے جس کا ذکر میں نے اپنے اصل مضمون میں کر دیا ہے۔وہ یہ کہ سیدنا مسیح کی امت کسی طور پر وہ پتھر نہیں تھی کہ جس پر آنجناب کے یہ الفاظ صادق آسکیں کہ جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن وہ جس پر گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔

مسیحیوں کو یہودیوں پر تو غلبہ رہا ہے لیکن تاریخ میں ابتدائی تین صدیوں تک رومی مشرک انھیں کچلتے رہے اور پھر اسلام کے بعد اگلے 1200 برس تک وہ مسلمانوں کے ہاتھوں بری طرح پٹتے رہے ہیں۔ایسے میں وہ کسی طور پر سیدنا مسیح کے ان الفاظ کا مصداق نہیں جو آنجناب نے ارشاد فرمائے۔جبکہ نبی کریم کے ساتھیوں سے جو ٹکرایا یا جس کسی سے وہ ٹکرائے سب کا انجام ایک ہی ہوا۔اس لیے تاریخی طور پر عیسائی کسی پہلو سے اس پیش گوئی کے مصداق نہیں ہو سکتے۔

تاہم یہ میری رائے ہے۔اس پر آپ غور کیجیے۔میں بھی غور کرتا رہوں گا۔

والسلام

ابو یحییٰ

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

قرآن میں گرامر کی غلطیاں

انٹرنیٹ کی ایجاد کے بعد مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ اب کم وبیش ان تمام اعتراضات سے واقف ہوتا چلا جا رہا ہے جو قدیم مستشرقین اور جدید مغربی مفکرین اللہ تعالیٰ کی ہستی، اسلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن مجید اور خود نفس مذہب پر کرتے رہے ہیں۔اس کا ایک علاج ہماری قوم نے یہ ڈھونڈھا ہے کہ ایسی سائٹ کو بلاک کرا دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی علاج نہیں۔ یہ شترمرغ کی طرح طوفان کی آمد پر ریت میں سر چھپانے کا عمل ہے۔

ہمیں بہرحال اپنے دین کی تعلیمات پر یہ اعتماد ہے کہ وہ کسی بھی چیلنج کا جواب دے سکتی ہیں۔ چنانچہ ہم یہ خدمت اپنی حقیر حیثیت میں کرتے رہتے ہیں۔اس ماہ میں میں Intelligent Design کے نام سے قارئین نے جو مضمون رسالے کی ابتدا میں ملاحظہ کیا ہے وہ فیس بک پر لگے ہوئے ایسے ہی کچھ اعتراضات کا جواب تھا۔الحمدللہ قارئین اس مضمون میں دیکھ سکتے ہیں کہ کہ کس طرح اعتراض کی کمزروی کو واضح کر دیا گیا ہے۔

آج اس کالم میں میرے پیش نظر ایسی ہی ایک خط وکتابت کو پیش کرنا ہے جس میں قرآن مجید پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔اس طرح کی چیزوں کو پیش کرنے کا اصل مقصد پڑھنے والوں میں یہ اعتماد پیدا کرنا ہے کہ کوئی اعتراض سامنے آئے تو گھبرائیں نہیں۔آپ کا مذہب اللہ کا دین ہے۔ یہ فکری طور پر اتنا مضبوط ہے کہ اس کی کسی بات کو غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اس تمہید کے بعد آپ یہ خط وکتابت ملاحظہ فرمائیے۔

السلام علیکم

میں نے مستشرقین کی ایک کتاب پڑھی تھی۔قرآن اوراسرائیلیت۔اس میں انہوں نے قرآن پاک کی فصاحت اور بلاغت اور ہزاروں کی تعداد میں ہوئی غلطیاں ثابت کی ہیں۔وہ قرآن واسلام کے بارے میں شک وشبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔یہ سب کیسے ممکن ہے؟ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

السلام علیکم

میں نے اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''قسم اس وقت کی'' میں بیان کیا ہے۔یہاں اس کا اقتباس پیش ہے۔لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ پوری کتاب کو پڑھیے اس میں اور بھی بہت سے الزامات کے جواب ہیں۔

''قسم اس وقت کی'' سے اقتباس

''قرآن کے ذکر پر کرن نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا:

قرآن کا ذکر تو آپ بالکل نہ کیجیے۔ساری مذہبی کتابوں کی طرح اس میں بھی بڑی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

فاریہ جو کرن کی یہ بات پہلے بھی کئی دفعہ سن چکی تھی،وضاحت کرتے ہوئے بولی:

کرن کا کہنا ہے کہ قرآن میں زبان و بیان اور گرامر کی بہت سی غلطیاں ہیں۔اس لیے یہ اللہ کا کلام نہیں ہوسکتا۔

فاریہ کی اس بات پر عبداللہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا:

کرن صاحبہ تو اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں مانتیں۔اس لیے قرآن کا اللہ کی طرف سے ہونا نہ ہونا

ویسے بھی ان کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر میں بتاتا ہوں کہ یہ دراصل کس کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ درحقیقت اسلام مخالف مستشرقین کا ہے جو اللہ کو تو مانتے ہیں، مگر قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے۔ مگر ایسی باتوں کی کمزوری تو دومنٹ میں واضح ہوسکتی ہے۔

وہ کیسے؟، فاریہ نے اشتیاق کے ساتھ کہا۔

دیکھیے قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، یہ ثابت کرنا سب سے زیادہ قرآن مجید کے پہلے مخاطبین مشرکین عرب کے لیے اہم تھا۔ یہ کام سب سے زیادہ آسانی سے وہی کر بھی سکتے تھے۔ کیونکہ وہ شعروخطابت اورادب وبلاغت کے بادشاہ تھے۔ انہیں یہ کوشش بھی ضرور کرنی چاہیے تھی کیونکہ وہ اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ اس دشمنی میں انہوں نے ہر حربہ اختیار کیا، مگر کبھی یہ نہیں کہا کہ قرآن میں گرامر یا زبان کی کوئی غلطی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن میں کوئی غلطی وہ لوگ دریافت نہیں کرسکے تو پھر سیکڑوں سال بعد پیدا ہونے والے لوگ کیسے قرآن کی غلطی نکال سکتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے اردو یا فارسی زبان بولنے والا کوئی شخص گرامر کی کتابوں سے انگریزی سیکھے اور پھر دنیا کو یہ بتائے کہ اس نے شیکسپیر کے کلام میں غلطیاں نکال لی ہیں یا پھر کوئی انگریز اردو سیکھ کر دنیا کو بتائے کہ کلام غالب میں فلاں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ یاد رکھیے کلاسیکل لٹریچر سے زبان کے قواعد وجود میں آتے ہیں۔ قواعد کی بنیاد پر ان کو پرکھنا سطحی اندازفکر کی دلیل ہے۔ یہی سبب ہے کہ جو غلطیاں مستشرقین قرآن میں نکالتے ہیں وہ کسی ناواقف شخص کو تو کچھ متاثر کرسکتی ہیں، لیکن زبان وبیان کا اچھا ذوق رکھنے والا کوئی شخص ان سے پہلے کبھی متاثر ہوا ہے نہ آئندہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سارے اعتراضات بچکانہ نوعیت کے ہیں۔

پھر اس نے ایک اور آسان مثال سے اپنی بات کی وضاحت کی:

عربی گرامر کی بنیاد پر قرآن میں غلطیاں نکالنا ایسا ہی ہے جیسے میڈیکل کی کسی کتاب میں کسی

انسانی عضو کے کچھ فنکشنز لکھے ہوں۔ پھر تحقیق سے معلوم ہو کہ یہ عضو ایک اور کام بھی کرتا ہے۔ اب صحیح رویہ تو یہ ہوگا کہ اس عمل یا فنکشن کو میڈیکل کی کتاب میں لکھ دیا جائے، نہ کہ میڈیکل کی کتاب کو بنیاد بنا کر یہ کہا جائے کہ فلاں عضو میں ایک غلطی دریافت ہوگئی۔''

شکریہ ابو یحییٰ صاحب۔ آپ نے میرے کمنٹ کو جواب کے قابل سمجھا۔ میں نے آپ کی کتاب پڑھی۔ لیکن مستشرقین کہتے ہیں کہ للکار خداوندی پر عرب کے لوگوں نے قرآن کے مقابلے کا کلام پیش کیا تھا لیکن مسلمانوں نے دبا دیا۔ اور ہمیں اس کے ثبوت ملے ہیں۔

بھائی ان سے کوئی پوچھے کہ مسلمان قرآن کے کسی جواب کو اسی وقت دبا سکتے تھے جب وہ طاقتور ہوتے۔ معمولی علم رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ مکہ میں جب یہ چیلنج دیا گیا تھا تو مسلمان بہت تھوڑے، کمزور اور مغلوب تھے۔ اگر ایسے میں قریش مکہ کی طرف سے کوئی مناسب جواب دیا جاتا تو مسلمانوں کی اخلاقی حیثیت مکمل طور پر ختم ہو جاتی۔ کمزور کا کل سہارا اس کی اخلاقی حیثیت ہوتی ہے۔ وہ ختم ہو جائے تو کیسے ممکن تھا کہ لوگ اسلام کی اخلاقی تعلیم سے متاثر ہو کر ایمان لاتے اور ہر طرح کا ظلم وستم برداشت کرتے۔ مزید یہ کہ تاریخ میں قرآن کے جس جواب کا ذکر ملتا ہے وہ نبوت کے جھوٹے مدعیوں نے آخری وقت میں دیا تھا جب مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ مگر اس جواب کو بھی مسلمانوں نے نہیں دبایا بلکہ وہ پورا کا پورا بغیر تبدیلی کے آج کے دن تک تاریخ کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ قریش کے عربوں نے جن کو یہ چیلنج دیا گیا تھا کبھی کوئی جواب دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے۔

بہت شکریہ سر آپ نے میرے وسوسے کو دور کر دیا۔ خدا آپ کو اپنی رحمت اور نوازش سے مالا مال فرمائے۔ ویسے اگر ان ملحدین کو ایک سوال کا جواب دیا جائے تو یہ دس سوال مزید اٹھالاتے ہیں۔ ان کا کوئی علاج نہیں سمجھ میں آتا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہر آدمی کو حق تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

\-

جی آپ نے درست فرمایا ہے ہر جواب کے بعد دس سوال اٹھائے جاسکتے ہیں۔ اسی لیے میں نے ''قسم اس وقت کی'' میں یہ اہتمام کیا ہے کہ مثبت بنیادوں پر ایک ایسے استدلال سے آخرت، خدا اور رسالت کو ثابت کروں جس کا جواب دینا ممکن ہی نہیں۔ ہو سکے تو اس پہلو سے ''قسم اس وقت کی'' کو دوبارہ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن اپنی بات کو کیسے معجزانہ طریقے پر ثابت کرتا ہے۔

\-

اس نے کیا پایا جس نے خدا کو کھو دیا
اس نے کیا کھویا جس نے خدا کو پالیا (بندۂ خدا)

\-

وقت کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ
اس کام کا آغاز ہے جسے آپ پورا نہ کریں
(ابویحییٰ)

\-

سوال وجواب

ابو یحییٰ

انبیا کے نام کے ساتھ علیہ السلام لگانا

سوال: السلام علیکم

میں ''جب زندگی شروع ہوگی'' اور ''قسم اس وقت کی'' کا ایک باقاعدہ خریدار اور ڈسٹری بیوٹر ہوں۔ تاہم اس کے علاوہ میں اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا بھی لیتا ہوں۔ اس بار مجھے اپریل کے ماہنامہ انذار کی کاپی بھی ملی۔ یہ موجودہ روائتی طریقوں سے ذرا مختلف انداز میں دین کی تشریح کو اچھے انداز میں پیش کرنے کی ایک عمدہ کاوش ہے۔ اس کے متعلق میری رائے درج ذیل ہے۔

ا۔ ''انذار'' میں گفتگو کا انداز ادبی اور فلاسفی طرز کا ہوتا ہے جو کہ عام لوگوں کے لیے کبھی مشکل بن جاتا ہے۔ اس کو آسان انداز میں بیان کرنے کے لیے کوشش درکار ہے۔

۲۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ درود شریف لکھتے ہیں لیکن میری نظر سے گزرا کہ آپ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے نام مبارک کے ساتھ علیہ السلام نہیں لکھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ فرض ہے یا نہیں لیکن ان کی عزت وشرف کو سامنے رکھتے ہوئے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ان کے اور دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام کے نام کے ساتھ علیہ السلام لکھا جائے۔

اللہ پاک آپ کی محنت شاقہ کو قبول فرمائیں اور ہمیں اسلام کو اس کی اصل صورت میں سمجھنے اور آگے پھیلانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ محمد قاسم جان

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ای میل اور فیڈ بیک کا بے حد شکریہ۔ اللہ تعالیٰ اپ کی دعوتی جدوجہد کو قبول فرمائے اور آپ کو اپنے کاموں میں لگائے رکھے۔

انذار کو سراہنے کا شکریہ۔ اس کے بارے میں آپ کی دونوں باتیں درست ہیں۔ یہ بات کہ انذار کے بعض مضامین علمی نوعیت کو ہوتے ہیں اور کچھ ادبی اسلوب میں لکھ دیے جاتے ہیں بالکل درست ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے مضامین بہت سادہ اور آسان ہوتے ہیں۔ دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے قارئین جس سطح کو لے کر میرے پاس آئیں، واپس جائیں تو ان کی سطح کچھ بلند ہو چکی ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض قارئین کی سطح علمی ہوتی ہے۔ بعض مضامین کا تقاضہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان ایک خاص سطح پر رکھی جائے۔ اس لیے بعض اوقات کچھ مضامین کو ایک خاص انداز سے لکھنا پڑتا ہے۔

رہی دوسری بات تو بلاشبہ انبیا علیہم السلام ہمارے لیے انتہائی مقدس ہستیاں ہیں۔ ان کا ادب ضروری ہے۔ ان کی اہانت کا ہلکا سا پہلو بھی ایمان کے خاتمے کا سبب بن سکتا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دین اپنی تعلیمات میں انبیا کے نام کے ساتھ علیہ السلام لکھنا اور ہر موقع پر لکھنا لازم نہیں قرار دیتا۔ یہ ایک مندوب اور پسندیدہ ہی ہے۔ بدقسمتی سے اس خاص معاملے میں ہمارے ہاں غلو بڑھتا جارہا ہے۔ یعنی انبیا کے ناموں یا ان کے ذکر کے ساتھ علیہ السلام وغیرہ لکھنا اب کم و بیش فرض سمجھا جاتا ہے۔ جو یہ نہ کرے وہ بے ادب اور گستاخ قرار پاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے اسلاف اور اہل علم تو اس چیز کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کے لیے بھی فرض قرار نہیں دیتے۔ مثلاً امام اعظم اور امام مالک کے نزدیک زندگی میں ایک دفعہ درود پڑھنا فرض ہے اور اس کے علاوہ مستحب ہے۔ یہی جمہور علما کا مسلک ہے۔ جب کہ بعض اہل علم جیسے امام سخاوی کی رائے ہے کہ کسی مجلس میں ایک دفعہ آپ کا نام نامی آنے پر درود پڑھنا واجب ہے اور اس کے علاوہ مستحب۔ یہی بات ابن عابدین نے درالمختار میں بیان کی ہے۔ یہ بڑی جامع، متوازن اور عمدہ رائے ہے۔

میں اسی رائے پر عمل کرتا ہوں۔ یعنی بعض مواقع پر میں انبیا کے نام کے ساتھ علیہ السلام لکھ دیتا

ہوں اور بعض مواقع پر جان بوجھ کر نہیں لکھتا۔ لکھتا اس لیے ہوں کہ لوگوں کو ترغیب ہو اور چھوڑتا اس لیے ہوں کہ لوگ جان لیں کہ یہ فرض نہیں ہے۔

امید ہے میرا نقطہ نظر واضح ہو گیا ہوگا۔

گناہ کبیرہ سے متعلق سوال

سوال: اسلام علیکم

کچھ سوال ہے جو میرے ذہن سے جاتے نہیں شیطان بار بار انکو میرے ذہن میں ڈالتا ہے! وہ یہ ہے کہ کیا قتل، زنا اور اس جیسے گناہ کبیرہ اگر کسی سے سرزد ہو جائیں تو اس وقت تو خلافت نہیں ہے کہ اسے سزا دی جائے تو کیا اس شخص کی سچے دل سے معافی کے بعد اللہ تعالی اسے معاف کر دے گا؟ کیا یہ کبیرہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں؟ برائے مہربانی میرے اس سوال کا جواب دیجیے۔ ریاضت خان

جواب: قران کریم سے واضح ہے کہ توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ چاہے زنا ہو یا اور کوئی کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو۔ تاہم قتل بہت بڑا اور سنگین جرم ہے۔ کسی کی جان لینا ایک انسان، خاندان بلکہ پوری انسانیت کو مار ڈالنے کے برابر ہے۔ اس کی سنگینی یہ ہے کہ اللہ سے تو معافی مانگ لی لیکن جس انسان سے معافی مانگنی ہے وہ اس دنیا ہی میں موجود نہیں رہا۔ اس کے خاندان کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ہر حال میں ایک نا قابل تلافی نقصان ہے۔ اس لیے کسی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا بھی بہت زیادہ ہے اور اسکی معافی کا امکان بہت کم ہے سوائے اس کے کہ کوئی شخص اپنی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دے۔ ایسا شخص اگر اللہ کے حضور معافی چاہتا ہے تو دین میں اس حوالے سے جو دنیوی ضابطہ ہے وہ درج ذیل ہے:

- مجرم اپنے اپ کو قتل کے لیے ریاست کے سامنے پیش کر دے۔

- ریاست اسے مقتول کے قتل کے جرم میں پھانسی دے دے۔
- یا پھر مقتول کے ورثا اپنی مرضی سے اسے معاف کر دیں
- وہ شخص مقتول کا خوں بہا دے

ان سب کے ساتھ وہ شخص سچے دل سے توبہ کرے، اپنے ایمان کی تجدید کرے۔ اگر مقتول کے ورثا معاف کر دیں تو ان کا اور ساری انسانیت کا خیر خواہ بن کر زندگی گزارے۔ ورنہ اعتراف جرم کر کے اور توبہ کرتے ہوئے پھانسی پر چڑھ جائے۔ تبھی جا کر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ درگزر کا معاملہ کریں گے۔

سورۃ الفرقان کی آیہ مبارکہ کی وضاحت

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر قرآن پاک کے پارہ ۱۹ سورۃ الفرقان میں ایک آیت مبارکہ ہے

والذین اذا ذکّروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا

اس آیت مبارکہ کی تشریح وتفسیر یا جو بھی آپ مناسب سمجھیں اس کے متعلق وضاحت فرمایئے۔ کیا اللہ پاک ہمیں اپنی بات کو ماننے سے پہلے بھی کسی غور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں؟

میں جانتا ہوں کہ اللہ پاک کے متعلق یہ بات بہت اعلیٰ ہے کہ لیس کمثلہٖ شئی ء

اور یہ بھی کہ ہم اللہ پاک کی کسی صفت کی مثال بھی اس دنیا کے لحاظ سے مکمل بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن دنیا کے لحاظ سے ہر بادشاہ کے دربار میں یہ اصول و قانون چلتا ہے کہ بادشاہ جو بھی کہے اس پر گونگے، اندھے اور بہرے بن کر عمل کیا جائے۔ کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر چہ بات عقل کے کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو۔ اگر چہ دیئے گئے حکم میں کام کرنے والے کو تکلیف، مصیبت یا عذاب کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن پھر بھی بادشاہ کی یہی خواہش

ہوتی ہے کہ اس کی بات گونگے، اندھے اور بہرے بن کرسنی جائے اور اس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کیا جائے۔ توحقیقی بادشاہ - بادشاہوں کا بادشاہ - مالک الملک اس آیت مبارکہ میں کیا ارشاد فرمارہے ہیں؟

برائے کرم اس بات کا جواب عنایت فرمایئے۔ جزاک اللہ خیر

والسلام عبداللہ

جواب:

برادر عزیز

آپ کا یہ سوال بالکل درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیثیت، طاقت اور عظمت اتنی غیر معمولی حد تک بلند ہے کہ بلاشبہ اس کی قدرت کے سامنے کسی مخلوق کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اس کی نافرمانی کر سکے۔ نہ اس جیسی علیم و حکیم ہستی کے کسی حکم کے حوالے سے یہ ممکن ہے کہ اس کی کوئی مخلوق اس کے کسی حکم میں کوئی کمی، خامی یا عیب نکال سکے۔ اس کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں انسانوں کو اپنی آیات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے اور اپنی ذات پر ایمان کے لیے دلائل فراہم کرتے ہیں تو اس کی وجہ انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی اسکیم ہے۔ وہ اسکیم یہ ہے کہ اس دنیا میں انسانوں مکمل اختیار اور ارادہ دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو غیب میں رہتے ہوئے اللہ کو مانیں اور چاہیں تو اس کا انکار کردیں۔ یہی معاملہ اس کے احکام کا ہے۔ لوگوں کو مکمل اختیار ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی فرمانبرداری کریں اور چاہیں تو نافرمانی کریں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک عقلی اور اخلاقی وجود بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ہر کام مجبور ہو جانے یا خواہش کے ہاتھوں مغلوب ہونے پر ہی نہیں کرتا بلکہ بہت سے کام عقلی طور پر قائل ہونے اور اخلاقی طور پر قابل اطمینان ہونے کے بعد بھی کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر لوگ صحیح چیزوں کو مانتے اور غلط چیزوں کو رد کرتے ہیں۔

ٹھیک اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ عقلی طور پر اپنا یہ اخلاقی مقدمہ قرآن مجید میں ثابت کرتے ہیں کہ وہی ایک رب ہیں اور انھی کے احکام اطاعت کے قابل ہیں۔ اب لوگوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو اس معقول بات کو مانیں یا نہ مانیں۔ مگر ساتھ میں وہ یہ ضرور بتا دیتے ہیں کہ یہ اختیار لامحدود نہیں بلکہ اس مختصر زندگی کے خاتمے کے بعد ایک دوسری دنیا قائم ہوگی جہاں لوگوں کو اپنے ہر عمل کا جواب دینا ہوگا۔ نافرمانی کا نتیجہ جہنم اور اطاعت کا بدلہ جنت ہے۔

اب آپ سوچیے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں پر جبر شروع کر دیں کہ وہ عقلی اور اخلاقی طور پر قائل ہونے کے بجائے ان کی قوت کے سامنے مجبور ہو کر ان کی بات مانیں تو دوسری مخلوقات یہ اعتراض کرنے میں عین حق بجانب ہوں گی کہ جنت کی بادشاہی اور خلافت ارضی کا منصب انسان کو کیوں دے دیا گیا۔ وہ یہ اعتراض نہ بھی کریں تب بھی یہ چیز خلاف عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ عدل کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتے۔ اس لیے انھوں نے اپنے منصوبے کو انتہائی جزئی تفصیلات کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کر رکھا ہے کہ یہ امتحان غیب میں رہتے ہوئے اور مکمل اختیار اور آزادی رکھنے کے باوجود محض ایک بات کو صرف عقلی اور اخلاقی بنیادوں پر درست مان کر عمل کرنے کا ہے۔ اس مقصد کے لیے آزادی و اختیار اور عقل و اخلاق کو پیدائشی طور پر دے دیے گئے۔ اس لیے رحمت الٰہی کا تقاضہ یہ تھا کہ جس چیز کو منوانا ہے اس کا معقول اور اخلاقی طور پر درست ہونا بھی ثابت کیا جائے۔ یہی اس طرح کی آیات کا اصل مقصد ہے۔

اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان سے ڈنڈے کے زور پر کچھ کرانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جب کوئی نصیحت اور عقلی نشانی بیان کی جاتی ہے تو وہ جانوروں کی طرح بے حس بننے کے بجائے اطاعت کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جنت اسی کا بدلہ ہے۔

پروفیسر محمد عقیل

بیمار بچے کا پروٹوکول

مجھے یاد ہے جب میں بچپن میں بیمار پڑتا تھا تو اسپیشل ٹریٹمنٹ ملتی تھی۔ امی آگے پیچھے ہوتیں، دادی پہلے سے زیادہ پیار کرتیں، دادا پیٹھ پر لئے بہلانے کی کوشش کرتے اور ابو کی دبی ہوئی شفقت ونرمی عیاں ہوجاتی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان دنوں میں نت نئے اور مہنگے کھلونے دلائے جاتے اور ہر قسم کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ منہ کی کڑواہٹ، جسم میں درد کی شدت، اعصاب کی کمزوری اور زودحسی چین نہیں لینے دیتی تھی۔ اس بے چینی میں ماں کا پیار برا لگتا، دادا دادی کا لاڈ بے وقعت محسوس ہوتا اور ابو کی شفقت بے معنی محسوس ہوتی تھی۔ ان تکالیف کے سبب اس اسپیشل پروٹوکول کا احساس وادراک ہی نہ ہوتا تھا۔ لیکن جونہی صحت نصیب ہوتی تو ساری باتیں یاد آجاتی اور دوبارہ بیمار پڑنے کو جی چاہتا تھا۔

آج جب کوئی شخص معذور ہوتا ہے تو وہ خود کو تکلیف میں گھرا محسوس کرتا ہے۔ جب وہ کسی غم میں مبتلا ہوتا ہے تو رنج والم کو اوڑھنا بچھونا بنا تا ہے، کسی صبر آزما مرض کا شکار ہوتا ہے تو مایوسی کا دامن تھام لیتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ وہ اسپیشل ہے، بہت اسپیشل، بہت ہی خاص۔ اس کے گرد خدا کے فرشتے کھڑے ہیں جو اپنے رب کے حکم پر اس کے لاڈ اٹھانے کے لئے تیار ہیں، جو اس کے لئے نعمتوں کے کھلونے لئے حاضر ہیں، جو اس کی بلائیں لے رہے، جو اس پر واری ہورہے، اس پر خدا کی جانب سے شفقت ورحمت نچھاور کررہے، اس کے ہر درد پر گناہ جھاڑ رہے اور ہر آہ کو نیکیوں میں بدل رہے ہیں۔ لیکن اس بیمار شخص کو یہ فرشتے نظر نہیں آتے، اسے خدا کی شفقت محسوس نہیں ہوتی، اسے ان دیکھی رحمتیں سمجھ نہیں آتیں، اسے نعمتوں کے وعدے برے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی بیماری، رنج، الم اور پریشانی سے اٹھ کر دیکھنا ہی نہیں

چاہتا۔

جب آخرت میں اس شخص پر یہ حقیقت واشگاف ہوگی تو وہ حیران رہ جائے گا۔ اسے نظر آجائے گا کہ اس کے ہر آنسو کے بدلے جنت کی نہریں تھیں، اس کی ہر آہ کا نتیجہ جنت کی باد صبا تھی، اس کی ہر بے چینی کا اجر فردوس کی بے خوف زندگی تھی، اس کے ہر صبر کی جزا رب کی محبت بھری نگاہ تھی۔ وہ یہ سب جان کر اس بچے کی طرح خواہش کرے گا کہ کاش وہ دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے اور دوبارہ انہیں مصیبتوں میں گرفتار ہوکر صبر کرے تاکہ پھر فرشتے اس کے گرد طواف کریں، پھر خدا کی شفقت کا نادیدہ ہاتھ اسے اپنے سر پر محسوس ہو اور پھر سے وہ خدا کی جانب سے دیئے گئے کھلونوں سے بہلایا جائے۔

نیت کرتا ہوں میں

ایک صاحب دوڑتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔ امام صاحب قرات کررہے تھے۔ وہ صاحب جلدی جلدی صف میں کھڑے ہوئے اور بولنا شروع کیا:

''نیت کرتا ہوں میں چار رکعت نماز عشاء کے فرض کی منہ میرا قبلہ شریف کی طرف ارر......''

امام صاحب کی قرات کی بنا پر وہ بھول گئے کہ آگے کیا کہنا ہے اور پھر سے نیت کرنے لگے:

''نیت کرتا ہوں میں تین رکعت نماز عشاء کے فرض کی، واسطے اللہ تعالیٰ کے اررر............"

وہ پھر رک گئے کیونکہ انہیں یاد آ گیا کہ عشاء میں تو چار رکعتیں ہوتی ہیں۔ انہوں ایک مرتبہ اور زبان سے نیت کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ امام صاحب رکوع میں چلے گئے اور ان صاحب نے تنگ آکر زبان سے نیت کئے بنا ہی نماز میں شمولیت کا فیصلہ کرلیا۔

ہمارے ہاں اکثر عبادات میں زبان سے نیت کرنے پر زور دیا جاتا ہے جن میں روزہ، حج،

عمرہ ونماز وغیرہ شامل ہیں۔ میں اس وقت اس پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ عبادات میں زبان سے نیت کرنا درست ہے یا نہیں۔لیکن میں اتنا ضرور بیان کرنا چاہتا ہوں کہ نیکی کے کام میں نیت کرنا دراصل اپنے ارادے کو درست کرنے کا نام ہے۔ہم جانتے ہیں کہ اعمال کا دارومدار نیت یعنی ارادے پر ہے۔مثال کے طور پر ایک شخص نے کافروں سے جہاد اس ارادے سے کیا کہ لوگ اسے بہادر کہیں گے اور اس کی شہرت ہوگی۔اب اگر وہ جنگ میں مارا گیا تو وہ اللہ کے نزدیک شہید نہیں ہوگا۔

ارادے کی موجودگی اور اس کی درستگی کی ضرورت معیشت، معاشرت، اخلاقیات، خوردو نوش، عبادات غرض ہر معاملے میں ہے۔لیکن عبادات کے علاوہ باقی امور میں ہم یا تو سرے سے کوئی ارادہ ہی نہیں کرتے یا پھر غلط نیت رکھتے ہیں۔حالانکہ ارادے کی درستگی سے ہمارا عمل خدا کی رضا کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے اور اعمال کی اصلاح کا سبب بھی۔

مثال کے طور پر ہم صبح کا آغاز اس نیت سے کر سکتے ہیں کہ آج ہم جھوٹ نہیں بولیں گے۔ لوگوں سے ملتے وقت دل میں ارادہ کر سکتے ہیں کہ اس کا مذاق نہیں اڑائیں گے، کسی کی غیبت نہیں کریں گے، کسی پر طنز نہیں کریں گے۔اسی طرح ہم دفتر میں اس ارادے سے داخل ہو سکتے ہیں کہ آج کا کام دیانت داری سے کریں گے اور کوئی کام چوری و کرپشن نہیں کریں گے۔ مالی لین دین کے وقت یہ ارادہ کر سکتے ہیں کہ وعدہ پورا کریں گے، بازار میں داخل ہوتے وقت یہ ارادہ کر سکتے ہیں کہ نگاہوں کی حفاظت کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

نیت ایسا کام ہے جس کے ذریعے انسان خدا کا قرب بھی حاصل کر سکتا ہے اور شیطان کی معیت بھی۔ہمیں چاہیئے کہ اپنی نیت کو خدا کی رضا کے تابع کردیں، اعمال بھی انشاء اللہ سدھر جائیں گے۔

فرح رضوان

رمضان کی تیاری

فرض کریں کہ آپ کو ابھی اچانک سے خوشخبری ملے کہ آج سے ٹھیک دس دن بعد آپ کے انتہائی قریبی عزیز کی شادی طے ہوگئی ہے تو مبارک باد کے بعد یقیناً آپ کا پہلا ردعمل اس کی تیاری کی طرف دوڑ ہوگی ،ایک شادی کی ایک سو چھتیس رسومات میں کیا کیا پہننا ہے، کیا دینا ہے، کہاں دعوت پر بلانا ہے، خواہ آپ امیر ،غریب ،متوسط کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں کتنے ہی کثیر العیال ہوں یا کتنے ہی عدیم الفرصتی کا شکار، ٹائم مینجمنٹ سے لے کر اخراجات میں ایڈجسٹمنٹ تک سارے گر اور تمام خداداد صلاحیتیں اُمڈ اُمڈ کر نکل آئیں گی .... شادی ہو جائے گی .... عرصہ گزر جائے گا.... اور عرصے تک آپ شان سے اپنے دوستوں میں تذکرہ کرتے رہیں گے کہ فلاں وقت میں آپ نے کیا خوب کمالات کا مظاہرہ کیا۔

فرض کریں کہ نوکری یا بزنس میں ترقی کے ساتھ آپ کا تبادلہ ہو گیا اور پندرہ دن میں آپ کو نئے شہر میں جا کر بسنا بھی ہے، کام کا آغاز بھی کرنا ہے ..... فکر نہ کریں، کیونکہ یہاں بھی آپ کی تمام سپر مین صلاحیتیں جاگ جائیں گی اور عرصہ گزرنے کے بعد بھی آپ عرصے تک ، عام سے لوگوں میں بیٹھ کر، اپنے خاص کارنامے پر ہیرو بنے ان کو متاثر کرتے رہیں گے۔

فرض کریں کہ آج سے دس دن بعد رمضان آنے والے ہیں .... آپ خاتون ہیں تو اپنا فریزر سموسوں سے بھرنا شروع کر دیں گی ،حضرت ہیں تو آپ کو بس یہ سوال کرنا ہے کہ بیگم سموسے کم تو نہیں پڑیں گے ناں .... اور اگلا قدم ہوگا عید کی تیاری ،اب باقی پورا رمضان کا ایک مہینہ، گڈو ، پپو، منی ، ببلو کے جوتے کپڑے لینے، ان کی ممی کا درزی کے در پر حاضریاں دینے ، پاپا کا ان کو رائیڈ دینے میں، اور آخری دنوں میں بیوٹی پارلر، بوتیک اور سپر سٹورز پر رش میں انتظار کرنے میں لگا دینا ہے، عرصے سے یہی ہوتا آیا ہے، یہی ہماری ''روایات'' ہیں کہ ہم

عید الفطر کو بھی عید قرباں کی طرح مناتے ہیں اور اپنے زبان کے چسکوں، دکھاوے کی ہوس، انتہائی ناقص ٹائم مینجمنٹ، قلیل مفادات، علیل ترجیحات اور بھرپور سستی کے باعث، رمضان کا تمام حسن، اس کا فیض، اس کی برکات اس سے ملنے والی روحانیت، احساس تقدس اور تقویٰ سب کو عید کی تیاری کے نام پر قربان کر ڈالتے ہیں۔

مانا کہ ماہ رمضان میں خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں لیکن ہر عمل کے لیے اپنی نیت کو پرکھتے رہنا ہماری ذمہ داری ہے، اور عموماً برسوں سے جو ڈھیروں افطار بنانے اور عید کی بے لگام تیاریوں کا اہتمام ہے اس کے پیچھے روزے کو بہلانا، اور اس کے ذریعے بھوک اور پیاس کی شدت کو بھلانا ہوتا ہے جبکہ بزرگوں کا کہنا یہ ہے کہ آپ کو بھوک لگے یا پیاس آپ قرآن پڑھیں اور پھر دیکھیں کہ کس طرح آپ کی روح سیراب اور جسم توانا ہوتا ہے۔

انسان کے معدے، دماغ اور دل کا ایک انوکھا کنکشن ہے پیٹ بہت بھرا ہوا ہو تو نیند آتی ہے، کوئی بات سمجھ نہیں آتی، جبکہ پیٹ درمیانہ سا بھرا ہوا ہو تو علمی ادبی دینی بات دماغ تک پہنچ جاتی ہے، لیکن پیٹ خالی ہو تب دیکھی، سنی یا پڑھی ہوئی، حکمت کی باتیں سیدھی دل تک پہنچ جاتی ہیں، اس میں اس طرح بس جاتی ہیں کہ پھر دماغ پر زور ڈالتی ہیں کہ وہ ان پر عمل کے لیے دیگر اعضا یعنی آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں سب کو راضی کرے اور دماغ بھی جسم کو فوری میسج روانہ کرتا ہے کہ اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے، لیکن انسان کا پیٹ ہو تو خالی پر شاپنگ اور بازاروں کے چکر میں، دماغ دنیا کی رنگینیوں، مسائل، شور، ہنگامے، محاز آرائی، بحث تکرار، غصّے میں، الجھا ہوا ہو تو روح کو وہ کیفیت میسر آ ہی نہیں سکتی، جس میں نفس کی درست تربیت ہو سکے۔ ہم تو وہ قوم ہیں کہ ادھر کسی کی شادی ہوئی نہیں کہ اگلے مہینے خوشخبری کے منتظر رہتے ہیں، سال گذر جائے تو خدشات شروع اور اس کے کچھ عرصے بعد علاج اور پھر طعنے.... تو ہم سالہا سال اپنے روحانی بانجھ پن پر کیوں مطمئن رہتے ہیں؟ عرصے سے ہم رمضان گزارتے

آ رہے ہوتے ہیں لیکن ہمارے اندر خدا خوفی اور دین کی سمجھ جنم ہی نہیں لے کر دیتی ،شاید اس کی وجہ ہمارا پہلا کمال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس خاص حکمت کے تحت تقویٰ کے اس تربیتی کورس کو پورے ایک ماہ کے لیے رکھا ہے، ہم اپنی عقل لڑا کر اس کے do's and dont's میں خود ساختہ ترامیم کر لیتے ہیں کہ اس کا essence سکڑ کر دس سے پندرہ دن بن جاتا ہے اور dose پوری نہیں ہو پاتی یعنی ہم جو اپنے بچے کی مکمل حفاظت کی خاطر اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ویکسی نیشن کا اہتمام کرتے ہیں، بیمار ہو جائے تو ،اس کی تندرستی اور بہترین گریڈز کے لیے زبردستی پرہیز اور اینٹی بائیوٹک کا کورس مکمل کرواتے ہیں، یہاں مزے سے بد پرہیزی کی موجیں اڑاتے ہیں۔ دوسرا کمال یہ کہ اگر ہم کسی ،grumpy،cranky،colic بچے کے والدین ہوں جو کسی صورت کوئی کام نہیں کرنے دیتا، اور کوئی اسے، ایک گھنٹے سنبھال لے، تو ایک طرف ہم اس کے مشکور ہوتے ہیں دوسری جانب ہمارے اندر کا سپر ہیرو پھر جاگ جاتا ہے اور ہم دنیا بھر کے کام اس ایک گھنٹے میں نمٹا لیتے ہیں، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ شیطان مردود کو ایک ماہ کے لیئے بند کر دیتے ہیں پر ہم اس اتنی بڑی سہولت اور احسان کا فائدہ اٹھانے کو اہمیت ہی نہیں دیتے، سیل سیل سیل کے ہر بینر ہر فلائر پر لپکتے ہیں اور یہاں آسمان سے خزانہ برس رہا ہوتا ہے اور ہم ہولی دیوالی دسہرے کی طرح عید کی تیاریوں میں لگے ہوتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم ڈوب رہے ہیں، غرق ہونے کو ہیں، ڈوبتے کو تو تنکے کا سہارا ہی بہت ہوتا ہے ہم سنبھلیں گے تو دوسروں کو بچانے کے قابل ہوں گے، جہاز میں آکسیجن کم ہو جائے تو آکسیجن ماسک پہلے خود لگایا جاتا ہے تا کہ ہم ہوش میں رہیں اور اپنے بچوں کی حفاظت کر سکیں۔ اب بھی وقت ہے اس سال رمضان کو اس کے تقدس کے ساتھ گزارنے کے لیے ابھی سے عید اور اس کے بعد لگاتار آنے والی شادیوں کی تیاری کی جاسکتی ہے ورنہ ہم سے اچھی تو چیونٹیاں ہیں جو گرمیوں کے موسم میں خوب محنت مشقت کر کے سردی اور بارش کے موسم کا انتظام کر لیتی ہیں۔

مدیحہ فاطمہ

خیر اور شر کی جنگ۔۔۔انا اور ضمیر کا مکالمہ

وہ رو رہا تھا کیونکہ وہ آج پھر زخم خوردہ تھا۔ وہ اپنے ربّ سے لوگوں کی زیادتیوں کی شکایت کر رہا تھا۔ اس نے آسمان کی جانب ایک نگاہ ڈالی لیکن وہاں چارسو خاموشی تھی اس نے دوبارہ اپنے اندر جھانکا جہاں اس کے ضمیر اور انا کے بیچ سخت کشمکش جاری تھی۔ انا جو شکوہ کرتی اس کا ضمیر اسے اس کا جواب دے دیتا۔ یہ ایک طویل بحث تھی جو طول پکڑتی جا رہی تھی۔ آخر انسان نے تھک کر ضمیر کو مخاطب کیا: ''تم مجھے سمجھا رہے ہو تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں نے لوگوں کے ساتھ کبھی برا نہیں کیا پھر وہ میرے ساتھ برا کیوں کرتے ہیں؟"

ضمیر: ''ہاں میں جانتا ہوں تم جان بوجھ کر کچھ برا نہیں کرتے لیکن تم لوگوں کی ہر برائی پر انہیں برا بھلا کہتے ہو۔ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو کہ وہ تم سے محبت نہیں کر پاتے۔''

انسان: ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی برائی تو ان کی طرف سے ہوتی ہے اب میں انہیں برا بھی نہ کہوں۔ میں کوئی فرشتہ تو نہیں جو کچھ بھی محسوس نہ کرے میں انسان ہوں اور یہ ہی میری کمزوری ہے۔''

ضمیر: ''ہاں مت کہو برا، صبر کرو۔ صبر میں بہت اجر ہے۔ بے شک تم فرشتہ نہیں لیکن انسان تو ہو، اور انسان صبر کر کے وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جو فرشتوں کو بھی حاصل نہیں۔''

انسان: ''چلو مان لیا! لیکن میں صبر ہی تو کرتا ہوں کیا کبھی ان کو پلٹ کر جواب دیا یا کبھی ان سے قطع تعلق کیا۔ اللہ نے رشتوں کو جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے تبھی میں نے ان کے ہر ظلم پر چپ سادھی ہے کہ کہیں رشتے نہ ٹوٹ جائیں۔ لیکن اب بس! اب میں بھی ان کے ساتھ ویسے ہی پیش آؤں گا جیسا وہ مجھ سے پیش آتے ہیں۔''

ضمیر: ''نہیں تم یہاں غلط ہو اور تم ہرگز صبر نہیں کرتے۔''

انسان (طیش میں آ کر): ''یہ صبر نہیں تو اور کیا ہے؟ کبھی ان سے بدلہ نہیں لیا، ان کے ظلم پر چپ رہا، ان کو پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ لیکن اب میں برابر بدلہ لوں گا تا کہ انہیں اندازہ ہو کہ میں کوئی معمولی چیز نہیں۔ ہونہہ''

ضمیر نے بھی فوراً جواب دیا: ''صبر ہمیشہ پہلی چوٹ پر ہوتا ہے۔ ایسے نہیں کہ دل میں پہلے برا بھلا کہو گالیاں دو اور پھر چپ کر جاؤ اور کہو کہ اچھا! چلو میں نے صبر کر لیا۔ صبر تو تب تھا جب تمہیں تکلیف پہنچے تو تم دل میں بھی انہیں برا نہ کہو اور اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔''

انسان (غصے سے): ''اچھا! میں تو بہت برا ہوں نا تو پھر تم ہی بتا دو صبر کیا ہے۔''

ضمیر (اسکے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے): ''دیکھو! یہ جو مشکلات ہیں یہ اللہ ہی کی طرف سے تمہاری آزمائش ہیں، اور انکو کشادہ دلی سے قبول کرنا اور ان پر ترکِ شکایت ہی صبر ہے۔''

انسان: ''لیکن میرا دل لوگوں کے رویّے پر بہت روتا ہے، میں کیا کروں؟''

ضمیر: ''سب سے پہلے صبر کرنا سیکھو۔ یاد کرو! کفار مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے کیسے مظالم نہیں ڈھائے۔ لیکن رحمت دو جہاں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ہمیشہ ان کی بدتمیزیوں کے آگے خاموش رہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس وقت طاقت ور نہ تھے یا ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے سب کو معاف کر دیا ان کو بھی جنہوں نے مظالم ڈھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ حالانکہ تب وہ تعداد میں سب سے زیادہ اور طاقت ور تھے۔ لیکن انہوں بدلہ نہیں لیا کیونکہ ان کی یہ معافی اللہ تعالیٰ کے لیے تھی اور ان کی وہ دشمنی بھی اللہ تعالیٰ کے لیے تھی۔''

انسان (بے صبری سے): ''لیکن اللہ نے تو بدلہ لینے کا کہا ہے کہ جیسا وہ ظلم کریں اتنا ہی

بدلہ ہم بھی لے سکتے ہیں تو پھر میں کیوں نہیں لے سکتا بدلہ۔"

ضمیر: "اللہ نے تو یہ بھی کہا ہے کہ جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔اور ویسے بھی تمہیں بدلہ لے کر کچھ حاصل نہیں ہوگا صرف تمہارا نفس خوش ہوگا۔"

انسان(غصے سے): " تو میرا نفس ہی خوش ہو جائے۔کچھ تو سکون ملے گا مجھے۔"

ضمیر: "مسلمان نفس کو خوش نہیں کرتا۔کسی بزرگ نے کہا تھا کہ جنت صرف دو قدم ہے۔ایک قدم تم اپنے نفس پر رکھ دو،تو دوسرا قدم جنت میں ہوگا۔"

انسان: (خاموشی۔۔۔شاید اس کی انا پست ہو رہی تھی)

ضمیر: "تم برا بھلا کہنا چھوڑ دو اور اچھا ہی سوچو تا کہ وہ تمہاری مثبت سوچ کے اثر سے بدل جائیں۔تمہاری یہ منفی سوچیں انہیں تمہارا ہونے نہیں دیتیں۔"

انسان: " تو میں کیا کروں؟ میں جب اچھا سوچنے لگتا ہوں تو وہ پھر برائی کرتے ہیں۔اللہ ان کو ہدایت کیوں نہیں دے دیتا۔"

ضمیر: "ان کو ہدایت دینا اللہ کا کام ہے تم صرف دعا کر سکتے ہو۔لیکن تم وہ کیوں بھول رہے ہو جو اللہ نے تمہیں عطا کیا۔"

انسان: "کیا مطلب؟"

ضمیر: " ابھی نماز فجر میں تم نے سورۃ الضحیٰ کی تلاوت کی تھی اسکا ترجمہ یاد ہے نا؟"

انسان: "ہاں"

"قسم ہے روزِ روشن کی۔اور رات کی جب وہ چھا جائے۔نہیں چھوڑا آپکو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے رب نے اور نہ وہ ناراض ہوا۔اور یقیناً آخرت آپ کے لیے پہلی (حالت

یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے۔اور عنقریب آپکا ربّ آپ کو وہ کچھ عطا کرے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو جائیں گے۔ بھلا اس نے آپ کو یتیم پا کر جگہ نہیں دی (بیشک دی)۔اور راستے سے ناواقف دیکھا تو رستہ دکھایا۔اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یتیم پر ستم نہ کریے گا۔اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دیجیے گا۔اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہیے گا۔"

ضمیر: "اس سورہ میں مخالفین کی بے پناہ اذیت پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کے ساتھ ساتھ یقین دلایا کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مشکل حالات میں نہیں چھوڑا۔"

انسان: " (اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔لیکن یہ اب شکوے کے آنسو نہیں تھے ضمیر کو معلوم تھا تبھی اس نے اپنی بات جاری رکھی۔)

ضمیر: " اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو معلوم تھا کہ تم آج پھر دل گرفتہ ہو گے تبھی اس نے تمہیں یہ سورہ تلاوت کرائی تا کہ میں اسے تمہارے سامنے حجت پیش کر سکوں۔اگر تم غور کرو تو اللہ تم سے فرما رہے ہیں یہ تو دنیاوی آزمائشیں ہیں اور تم دنیا کی ہی فکر کر رہے ہو یہاں کے لوگوں کے رویے تمہیں تنگ کر رہے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آخرت کا اجر دنیا سے کہیں بہتر ہے۔ مجھ سے شکوے کر کے میری ناشکری نہ کرو۔تم بے آسرا تھے کیا میں نے تمہیں آسرا نہیں دیا۔تم تنگ دست تھے کیا میں نے تمہیں غنی نہیں کیا۔تم محتاج تھے کیا تمہیں لوگوں کی محتاجی سے نہیں بچالیا۔تم میری نعمتیں یاد کرتے رہو گے تو کبھی دل گرفتہ نہیں ہو گے۔"

ضمیر بول رہا تھا انسان سن رہا تھا۔ رو رہا تھا اور اللہ کی نعمتیں یاد کر رہا تھا۔واقعی وہ تھا ہی کیا۔۔۔کچھ سال پہلے وہ بے نمازی، گناہگار، ناشکرا اور بھٹکا ہوا تھا اور آج وہ ہدایت یافتہ تھا۔

وہ صراط مستقیم پر چلنا چاہتا تھا۔ اللہ نے اسے سیدھا راستہ دکھا دیا تھا۔ اس کو دنیا کی وہ تمام نعمتیں دی تھیں جو ایک عام انسان تصور کر سکتا ہے۔ ہدایت اور دل کی نرمی بھی تو اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ پھر بھی وہ شکوے کر رہا تھا۔ اگر اس کے ساتھ برا ہو رہا تھا تو اللہ اس کا نعم البدل بھی تو ان نعمتوں کی صورت میں دے رہے تھے۔ اللہ صحیح کہتے ہیں کہ ''اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

ضمیر: ''اگر اللہ ہمیں معاف کر دیتا ہے اور نعمتیں نچھاور کرتا ہے تو ہم کیوں نہیں اللہ کی خاطر اللہ کے بندوں کو معاف کر دیتے۔ کیوں صبر نہیں کرتے۔ آخرت کی بجائے دنیا والوں کی فکر میں لگے ہیں۔ تم صرف انہیں نظر انداز کرو بہتر ہے کہ معاف کر دو۔ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور انہیں ہرگز برا بھلا نہ کہو ورنہ صبر و برداشت کا کوئی فائدہ نہیں۔ دل وسیع کر لو۔ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور اس کا شکر ادا کرتے رہا کرو۔''

انسان کی انا جیسے جیسے ضمیر کی باتوں پر غور کرتی گئی وہ ٹوٹتی گئی یہاں تک کہ وہ غائب ہو گئی۔ اب انسان کا وہ روپ سامنے آ گیا جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ اب صرف وہ اور اس کا بہترین ساتھی اس کا ''ضمیر'' باقی رہ گیا۔

انسان نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اس کو صبر آ گیا تھا۔ وہ اب مسکرا رہا تھا اپنے پروردگار کی نعمتیں اور اپنے لیے اسکی محبت کو یاد کر کے۔ ضمیر بھی مسکرا رہا تھا اپنی کامیابی پر۔ لیکن دور کہیں کوئی رو رہا تھا۔ شیطان آج ناکام ہوا تھا اسے رونا تو تھا ہی کیونکہ آج پھر ضمیر کا خیر شیطان کے شر پر غالب آ گیا تھا۔

آسمانوں پر بہت دور ربّ کا نور بہت زور سے چمکا جیسے وہ بہت خوش ہو۔ فرشتے سمجھ گئے کہ لگتا ہے آج پھر کوئی اہلِ ایمان جیت گیا۔

ابو یحییٰ

مضامین قران (8)

دلائل آخرت

وجود باری تعالیٰ کے دلائل کے بعد ہم دلائل آخرت پر گفتگو شروع کررہے ہیں۔ توحید ،رسالت اور آخرت تینوں اسلام کے بنیادی عقیدے ہیں اور اپنے اپنے اعتبار سے تینوں کی بڑی اہمیت ہے۔ توحید اس پہلو سے سب سے اہم ہے کہ دین کی بنیادی دعوت ایک اللہ پر ایمان ہی کی ہے۔ رسالت اس پہلو سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ توحید ہو یا آخرت دونوں کا صحیح تصور ہی اس وقت سامنے آئے گا جب رسالت پر ایمان لائیں گے۔ آخرت اس پہلو سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ آخرت کا تصور نہ ہوتو توحید و رسالت سمیت دین کی تمام فکری اور عملی اساسات بس اخلاقی نوعیت کی کچھ باتیں رہ جاتی ہیں۔ یہ آخرت کا عقیدہ ہی ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دین آج ایک اخلاقی معاملہ ہے لیکن موت کے بعد یہ مادی نفع وضرر کی بنیاد بن جائے گا۔

اسلام میں تصور آخرت کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ دیگر تمام مذاہب یا تو آخرت کا کوئی تصور نہیں رکھتے یا پھر انتہائی مبہم اور غلط فہمیوں پر مبنی تصور رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی دعوت کا طرہ امتیاز عقیدہ آخرت کی تفصیلات اور اس کے دلائل کا بیان ہے۔ اسی لیے ہم آخرت کے دلائل سے آغاز کررہے ہیں۔ ہم نے ان دلائل کو جو قرآن میں جگہ جگہ دہرائے گئے ہیں سات عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے۔ یہ درج ذیل ہیں۔

۱) فطرت کی دلیل

انسانی فطرت میں خیر وشر کا شعور، ضمیر انسانی کی سزا و جزا کا نظام شاہد ہے کہ انسان سزا و جزا

کے تصور سے اچھی طرح واقف ہے اور سمجھتا ہے کہ ایک دن حتمی سزا جزا کا یوم قیامت آ کر رہے گا۔

۲) ربوبیت کی دلیل

ایک ایسی کائنات جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے زندگی کے لیے قطعاً ناموزوں ہے اس میں سرکش کائناتی طاقتوں کو لگام ڈال کر انسانوں کی زندگی اور ربوبیت کا بھرپور انتظام کیا گیا ہے کیسے ممکن ہے کہ یہ معجزانہ اہتمام دیکھ کر بھی بندگی سے انکار کرنے والوں کو ان کے کیے کی سزا نہ دی جائے اور بن دیکھے بندگی کرنے والوں کو ان کے اجر سے محروم رکھا جائے۔

۳) مقصدیت کی دلیل

تصورِ آخرت کو ہٹا دیا جائے تو پھر اس دنیا کو بسانے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا۔ خاص اس حقیقت کے مشاہدے کے بعد کہ انتہائی بامعنی اور منظّم کائنات میں انسانی زندگی ہر جگہ ظلم و ناانصافی اور عدم تکمیل سے عبارت ہے۔ اگر یہ دنیا اور اس کی موت ہی انسانی زندگی کا خاتمہ ہے تو اس سے زیادہ بے مقصد اور بے معنی بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ اس بات سے پاک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور آخرت دارالجزا۔ یہی اس دنیا کا مقصد ہے جو آخرت سے مل کر پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

۴) جوڑے کی دلیل

دنیا و آخرت کے جوڑے کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر بامعنی چیز جوڑوں میں بنائی گئی ہے۔ مرد عورت، دن رات، زمین آسمان سب جوڑے ہیں جو خالق کا طریقہ تخلیق بتاتے ہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔

۵) ترتیب و تدریج

کائنات کا ہر واقعہ ایک فطری ترتیب اور تدریج سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ صبح کے بعد شام اور شب کے بعد سحر ایک ترتیب سے اور بتدریج طلوع ہوتی ہے۔ ایسی ہی دنیا کی شب تاریک ایک روز صبح قیامت کی روشنی ضرور دیکھے گی۔

۶) قدرت کی دلیل

اس دلیل کے کئی پہلو ہیں جن کی تفصیل وقت پر آئے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ انفس و آفاق میں پھیلی تمام نشانیاں یہ گواہی دیتی ہیں کہ جس خالق نے ان کو پیدا کیا ہے وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے کہ انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر کے ایک نئی دنیا آباد کرے۔

۷) رسولوں کی امت کی سزا جزا

رسولوں کی امتوں کو تاریخ کے ہر دور میں ان کے انکار پر سزا دی گئی اور ماننے والے کو جزا دی گئی۔ یہ سزا و جزا اپنی ذات میں آخرت کی سزا جزا کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

[جاری ہے]

اہم یہ نہیں کہ رمضان میں آپ نے کیا اعمال کیے
اہم یہ ہے کہ رمضان کی تربیت نے آپ کو کیسا بنا دیا (ابو یحییٰ)

اصولوں کے لیے جنگ کرنا بہت آسان ہے
اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا بہت مشکل ہے (ماخوذ)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (12)

خلیج ازمت کے آخری کنارے پر ''ازمت'' شہر تھا۔ سڑک اور سمندر کے بیچ میں شہر نظر آ رہا تھا۔ مکانوں کی سرخ مخروطی چھتیں نیلے پانی اور زرد روشنی کے بیک گراؤنڈ میں نہایت بھلی لگ رہی تھیں۔

یہاں سے ایک سڑک ''برسا'' اور ''ازمیر'' کی جانب جا رہی تھی۔ اس سڑک پر ہمیں واپسی پر سفر کرنا تھا۔ ازمت سے آگے نکلے تو تھوڑی دیر میں ''اسپانزا'' کا شہر آ گیا۔ شہر کے ساتھ ہی ایک نہایت ہی خوبصورت جھیل ہماری منتظر تھی۔ یہ جھیل اسپانزا تھی۔ پورے کا پورا ترکی نہایت ہی دلفریب قدرتی اور مصنوعی جھیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس وقت تو نہیں البتہ واپسی کے سفر میں ہم نے اس جھیل پر کچھ وقت گزارا تھا۔

اسپانزا سے آگے ''ڈوزجے'' کا شہر آیا۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں کیتھولک چرچ سے متعلق کچھ کھنڈرات موجود ہیں جنہیں ''پروسیا اینڈ ہائیپئم'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک صوبائی دارلحکومت ہے۔ ترکی میں صوبے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ان کا ایک صوبہ کم و بیش ہمارے ایک ضلع کے برابر ہے۔ ہر پچاس کلومیٹر کے بعد نئے صوبے کی حدود شروع ہو رہی تھیں اور ہم تین گھنٹے میں پانچ چھ صوبے ''پھڑکا'' چکے تھے۔

سامنے اونچے پہاڑ نظر آ رہے تھے جن پر سبزہ بہت گھنا تھا۔ سردیوں میں یہ پورا علاقہ برف سے ڈھک جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم ان پہاڑوں کے دامن میں جا پہنچے۔ یہاں موٹر وے ایک سرنگ میں داخل ہو رہی تھی۔ بعد میں ہمیں اندازہ ہوا کہ ترکی میں سڑکوں پر بے شمار سرنگیں بنائی گئی ہیں۔ سرنگ کے اندر لائٹیں لگی ہوئی تھیں اور اسپیڈ لمٹ 120 سے کم کر کے 80 کر دی

گئی تھی۔

سرنگ شیطان کی آنت کی طرح کافی طویل ثابت ہوئی۔ساڑھے چار کلومیٹر طویل سرنگ پار کر کے ہم پہاڑوں کی دوسری جانب پہنچے تو ''بولو'' شہر کے آثار نظر آئے۔ہم دو پہر دو بجے استنبول پہنچے تھے۔اس کے بعد 300 کلومیٹر کا کافی طویل سفر طے کر چکے تھے۔اس وقت شام کے آٹھ بج رہے تھے مگر سورج ابھی سوا نیزے پر موجود تھا۔یہ علاقہ 40 درجے عرض بلد پر واقع ہے۔جیسے جیسے شمال کی طرف چلا جائے، گرمیوں میں دن اور سردیوں میں رات طویل ہوتی چلی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جولائی کے مہینے میں یہاں شام ساڑھے آٹھ بجے سورج غروب ہوتا ہے اور صبح چار بجے پھر طلوع ہو جاتا ہے۔

''بولو'' میں ایک رات

موٹر وے سے نکل کر ہم شہر کی جانب چلے۔وسیع وادی میں پھیلا ہوئے شہر کی عمارتوں کی سرخ چھتیں پیلے اور سبز بیک گراؤنڈ میں عجیب سا منظر پیش کر رہی تھیں۔بعد میں ہمیں اندازہ ہوا کہ پورے ترکی میں عمارتوں کی چھتوں کو مخروطی بنایا جاتا ہے اور ان پر سرخ ٹائلیں لگا دی جاتی ہیں۔اس طریقے سے پورا شہر سرخ سرخ محسوس ہوتا ہے۔

شہر میں داخل ہو کر میں نے ایک صاحب سے ہوٹل کا پوچھا۔ترکی میں ہوٹل کو 'اوٹل' کہا جاتا ہے۔انہوں نے ایک جانب اشارہ کر دیا اور اشاروں ہی اشاروں میں یہ بھی بتا دیا کہ یہ ون وے سڑک تھی۔ہمیں گھوم کر اس سڑک پر پہنچنا تھا۔میں نے بہتر یہی سمجھا کہ گاڑی ایک جگہ پارک کر کے پیدل ہی ہوٹل کی تلاش کی جائے۔جہاں میں نے گاڑی پارک کی، وہاں ایک دکان تھی جس پر "Terzi" لکھا نظر آ رہا تھا۔یہ واقعتاً درزی ہی کی دکان تھی کیونکہ ترکی زبان میں 'T' کو 'د' کے طور پر استعمال کر لیا جاتا ہے۔

ترکوں کی عجیب عادت تھی۔ اگر ان سے انگریزی میں کسی جگہ کا پوچھا جائے تو وہ انداز سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ حضرت وہاں جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ترکی زبان میں ایک طویل تقریر شروع کر دیتے ہیں اور تقریباً رقص کرتے ہوئے اشاراتی زبان میں اس خوبی سے راستہ سمجھاتے ہیں کہ راستہ واقعی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ان کی اس خوبی کے باعث ہم راستہ پوچھتے ایک ہوٹل میں جا پہنچے۔ ہوٹل کے منیجر کافی کم گو تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کسی بات کے جواب میں طویل تقریر کا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ سوال کے جواب میں مسکرا کر صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیتے۔ ہوٹل کافی معقول تھا۔ میں نے سوچا کہ ابھی وقت ہے، کیوں نہ ایک دو اور ہوٹل دیکھ لیے جائیں۔

قریب ہی ایک اور ہوٹل تھا جس پر ''کشمیر ہوٹل'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ نسبتاً مہنگا تھا اور معیار کے اعتبار سے پہلے ہوٹل جیسا ہی تھا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر سے وجہ تسمیہ پوچھی۔ وہ میری بات نہ سمجھے اور بولے، ''کشمیر انڈیا اور پاکستان میں ہے مگر یہ کشمیر ہوٹل ہے۔'' بعد میں تجربہ ہوا کہ ترکی میں بہت ہی کم لوگ اچھی انگریزی جانتے ہیں۔ ہم نے پہلے والے ہوٹل میں آ کر کمرہ لیا۔ سامان رکھا اور شہر گھومنے نکل کھڑے ہوئے۔

ماحول میں گھٹن

ہوٹل ایک پہاڑی پر تھا جس سے سیڑھیاں اتر کر نیچے بازار میں جا رہی تھیں۔ یہ بولو کا اندرون شہر تھا۔ ایک طرف تنگ سی سڑک تھی جس پر گاڑیاں چل رہی تھیں اور دوسری جانب یورپ کے شہروں کی طرح اینٹوں کا وسیع راستہ بنا ہوا تھا۔ شہر کا ماحول بڑی حد تک یورپی تھا۔ مغربی لباس میں ملبوس مرد و خواتین ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ بہت سی باحجاب ترک خواتین بھی تھیں مگر ان کی تعداد کم تھی۔ اس ماحول کی وجہ سے ہم بالکل اسی طرح کی گھٹن محسوس کر رہے تھے جیسے کوئی سیکولر لادین قسم کا اکیلا شخص اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ غلطی سے مولویوں میں آ

پھنسے۔

جس طرح قدیم دور میں شرک ایک عالمی برائی تھی، بالکل اسی طرح بے حیائی موجودہ دور میں ایک عالمی برائی بن چکی ہے۔ ارباب میڈیا نے اپنے لئے جو کردار منتخب کرلیا ہے، اس کے نتیجے میں انہیں نہایت ہی بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دوسری طرف ہمارے اہل مذہب ڈنڈے کے زور پر خواتین کو باپردہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس طریقے سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ لوگ ضد میں آ کر دین سے اور دور ہوتے چلے جائیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ بے حیائی کے برائی ہونے کا شعور لوگوں میں پیدا کیا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ بے حیائی برائی کیوں ہے؟ یہ انسانیت کے لئے کس طرح سے نقصان دہ ہے؟ اور اس کے نتائج کیا نکلیں گے؟

بے حیائی میں بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ اس کے نتیجے میں معاشرے میں بدکاری عام ہوتی ہے۔ مرد و خواتین اختلاط کے دوران اگر کچھ حدود کا خیال نہ رکھیں تو اس کے نتیجے میں ان کے تعلقات حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ جب یہ تعلقات حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو خاندان کے ادارے کی تباہی کا آغاز ہوتا ہے۔

اگر انسان جوان حالت میں کسی درخت سے اگ پڑتے اور جوانی کی حالت ہی میں اس جہان فانی سے کوچ کر جاتے تو شاید فری سیکس ہی انسان کے لئے بہتر نظام زندگی ہوتا۔ ایک مرد جتنی خواتین سے چاہتا، ازدواجی تعلقات قائم کرتا اور روزانہ نت نئے مزوں کو انجوائے کرتا۔ اسی طرح ایک خاتون جتنے چاہے مردوں سے تعلقات قائم کر کے روزانہ زندگی کی نئی جہتوں میں سفر کرتی۔ اس صورت میں کسی خاندان کی ضرورت نہیں تھی۔

حمد باری تعالیٰ

(پروین سلطانہ حنا)

مری صبح زندگی بھی ترے نام ہو گئی ہے
ترے ذکر سے منور مری شام ہو گئی ہے

کبھی کہکشاں کا منظر، کبھی چاندنی سے باتیں
تجھے دیکھنے کی عادت سر بام ہو گئی ہے

یہ فلک، یہ چاند تارے، ہیں فدا کہ جس پہ سارے
مری ذات بس اسی کی تو غلام ہو گئی ہے

تو ہی فکر کا ہے محور، مجھے وقت کی خبر کیا
کہاں صبح ہو گئی ہے، کہاں شام ہو گئی ہے

مرا حرف حرف چمکے، مرا لفظ لفظ مہکے
مری خوشبوئے تکلّم ترے نام ہو گئی ہے

ابھی آنکھ ہی کھلی تھی، ابھی ہوش ہی تھا آیا
میری عمر کی یہ پونجی تو تمام ہو گئی ہے

بڑی دیر تک سفر میں، مری خواہشیں رہی ہیں
یہ بساط اب سمیٹو، چلو شام ہو گئی ہے

ہیں جو چار سو ہمارے یہ جو حشر کے مناظر
دیکھو بیسویں صدی بھی تو تمام ہو گئی ہے

کہیں مجلسوں کی رونق، کہیں واعظوں کا مجمع
یہ روایتوں کی محفل بڑی عام ہو گئی ہے

مجھے لگ رہا ہے ایسے، کہ ہے چل چلاؤ جیسے
کہ ستاروں کی یہ محفل بھی تمام ہو گئی ہے

مرا انتخاب بھی تو، مرا انتساب بھی تو
یہ کتاب زندگی بھی ترے نام ہو گئی ہے

ابو یحییٰ کی نئی تصنیف

”حدیثِ دل“

زندگی اور شخصیت کی تعمیر کے لیے رہنما تحریریں

جو دل سے لکھی گئیں اور دل والوں کے لیے لکھی گئیں

”تیسری روشنی“

(مصنف: ابو یحییٰ)

☆ ابو یحییٰ کی داستان حیات۔ تلاش حق کی سچی کہانی

☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب

☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان

☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف

☆ ابو یحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 0332-3051201)

حرمتوں کے بارے میں خدائی ضابطہ

''اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو،
اور اسراف نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا،
اے رسول ان سے کہو، کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دی ہیں۔ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہل ایمان کے لیے ہیں، اور قیامت کے دن تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ اے نبی کہہ دو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں:
بے حیائی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے،
اور حق تلفی،
اور ناحق زیادتی،
اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم کسی چیز کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری،
اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔''

(الاعراف 7:33-32)